AL-AHQAQ Recognized by HEC in Y-Category
https://ahqaq.com/index.php/Journal/article/view/49 ONLINE - ISSN- 3006-595X
Volume.3, Issue.1 (2025) PRINT - ISSN- 3006-5941

شاعرِ آشفتہ نوا: مرزا اسد اللہ خاں غالب کے اسلوبِ بیان کی تنقیدی و تحقیقی تحلیل

The Poet of Restless Melody: A Critical and Research-Based Analysis of Mirza Asadullah Khan Ghalib's Poetic Style

Saira Bano

PhD scholar, Department of Urdu NCBA&E Multan

sb2036693@gmail.com

Ghulam Shabir

PhD scholar, Department of Urdu NCBA&E Multan

shabirsial506@gmail.com

Dr. Qamar Abbas

Lecturer, Department of Iqbal Studies, the Islamia University, Bahawalpur

qamarabbasrana74@gmail.com

Abstract:

In Urdu language and literature, countless poets have achieved universal status, but it is undisputable that a great poet like Mirza Ghalib, ahead of his time, gave a thought that influenced the times in every century. Ghalib appears before us in the form of a thoughtful thinker. His observation about life and its various aspects hold fascinating insight. Various critics merely speculate about life and its various aspects. His experiences and observations about life are everyone's experiences. They make a person recognize a different humanity. This article examines the universal elements in Ghalib's poetry that elevate him to the level of a universal poet. We find the simple things of life in simple words in Ghalib,s style. High imagination is everywhere and sometimes it reaches heights that are either very difficult or impossible for the reader to reach. Ghalib is a poet of brilliance in his art, unparalleled in his time and in the present century.

Key word: literature, universal, undisputable, fascinating, observation, various Speculate, recognize, elevate, imagination reader, brilliance, unparalleled

نام اسد اللہ خاں غالب۔ عرف میرزا نوشہ۔ تخلص غالب اور نجم الدولہ،، دبیر الملک،، نظام جنگ، خطاب۔ مرزا غالب آگرے میں 8رجب 1212ھ 27 دسمبر 1797ء میں پیدا ہوئے، والد عبد اللہ بیگ خان 1802ء میں راج گڑھ کی لڑائی میں انگریزوں کی گولی کا زخم کھا کر انتقال فرما گئے، چچا مرزا نصر اللہ بیگ نے بڑے ناز و نعم میں پرورش کی۔ خاندان کا سلسلہ افراسیاب حیدر آباد بادشاہ توران سے جاملتا ہے شاہ عالم کے زمانے میں غالب کے دادا گھر چھوڑ کر نکلے، دہلی آئے مگر یہاں کی سلطنت بھی باقی نہ رہی تھی صرف پچاس گھوڑے اور نقارہ نشان سے شاہی دربار میں عزت حاصل کی۔ شاہ عالم کے بعد طوائف الملوکی کا ہنگامہ گرم ہوا اور وہ علاقہ بھی نہ رہا۔ مرزا کے والد عبد اللہ بیگ لکھنؤ میں نواب آصف الدولہ مرحوم کے دربار میں حاضر ہوئے چند ماہ بعد حیدر آباد میں نواب نظام علی خان بھارو کی سرکار میں شہسوار کی جمعیت میں ملازم رہے۔ پھر راجہ بختاور کی ملازمت میں ہی جنگ میں مارے گئے، مرزا غالب کی عمر اس وقت 5 برس تھی ان کے چچا اس وقت مرہٹوں کی طرف سے اکبر آباد کے صوبہ دار تھے۔ 1806ء میں جنرل لیک کے دور میں جب صوبہ داری کمشنری میں تبدیل ہوئی تو مرزا نصر اللہ بیگ چار سو سواروں کے افسر مقرر ہوئے۔ 1700 روپے مہینہ معاوضہ مقرر ہوا اور سال بھر کی جاگیر ڈیڑھ لاکھ بنی۔ انہوں نے چچا کے زیر سایہ تربیت کا آغاز کیا تھا کہ مرگ نہ گہانی نے ان کے چچا کو بھی چھین لیا۔ جاگیر ضبط ہو گئی۔ اب مفلسی اور غریبی کا آغاز ہوا۔ وسیلوں اور کوششوں سے بھی کچھ نہ بنا اور قسمت نے پلٹا کھایا 1830ء میں کلکتہ گئے مگر ناکام ہوئے جوانی کا وقت تھا دلی آ گئے سکونت اختیار کی بلند حوصلہ اور بلند عزائم کے ساتھ جینا شروع کیا دقتوں اور مصائب کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ دلی کی تباہی کے ساتھ غالب پر بھی مشکلات کا آغاز ہو چکا تھا۔ چچا کی پینشن بند ہو گئی قلعہ کی تنخواہ بھی ختم ہوئی نواب رام پور کے پاس گئے ان سے بیس پچیس برس کا ساتھ تھا کلام کی اصلاح کیا کرتے تھے نواب صاحب نے 1859ء میں سو روپیہ مہینہ مقرر کیا پھر غالب کو اپنے پاس عزت و تکریم سے رکھا اور سو روپیہ مہینہ اور اضافہ کیا۔ دلی کی یاد ستائی تو واپس لوٹے پینشن جاری ہو چکی کچھ سکون میسر آیا مرزا تین بھائی بہن تھے، چھوٹی بہن ان سے بڑی اور بھائی مرزا یوسف بیگ خان چھوٹے تھے۔ 9صفر 19 اکتوبر 1857ء میں بحالت دیوانگی دلی میں بھائی کا انتقال ہوا۔ مرزا کی بیوی امراؤ بیگم نواب الٰہی بخش خان معروف کی بیٹی اور نواب احمد خاں والئی فیروز پور کی بھتیجی تھیں 1810ء میں غالب کے عقد میں آئیں اور غالب کے بعد تک زندہ رہیں۔ غالب کے ہاں سات اولادیں ہوئیں مگر کوئی پندرہ مہینے سے زیادہ زندہ نہ رہی۔ نواب زین العابدین خان عارف امراؤ بیگم کے بھانجے اور غالب کے شاگرد تھے۔ چھوٹے باقر علی خان تھے جن کو غالب نے اپنی اولاد کی طرح پرورش کی۔ غالب 1861ء میں درد قولنج میں مبتلا ہوئے اور بعد ازاں بخار میں مبتلا ہوئے اور مسلسل امراض کی مصیبت جھیلتے رہے۔ خوراک بھی ختم ہو گئی تھی آخر کار 73 برس میں 1869ء میں انتقال ہو گیا۔ مرنے سے چند دن پہلے ہی یہ شعر کہا

دم واپسیں بر سر راہ ہے　　عزیزو اب اللہ ہی اللہ ہے

قضاء قدر نے انہیں دلی میں ہی رکھا اور وہیں نظام الدین اولیاء کے مزار کے قریب اپنے خاندان کے احاطے میں مدفون ہوئے۔ غالب میں شاعرانہ ندرت خیال اور جدت فکر و نظر کی وسعت منفرد طرز میں سامنے آتی ہے وہ اردو اور فارسی زبانوں پر قدرت کاملہ رکھتے تھے۔ غالب نے دونوں زبانوں کے ادب میں مختلف موضوعات اور اصناف سخن پر خامہ فرسائی کی ہے۔ غالب کی شاعرانہ تخلیقات درج ذیل ہیں۔

1۔ عود ہندی، 2۔ اردوئے معلی 3۔ کلیات نظم فارسی 4۔ کلیات نثر فارسی، دیوان غالب اردو، 6۔ لطائف غیبی 7۔ تیغ تیز، 8۔ قاطع برہان، 9۔ پنج آہنگ، 10۔ نامہ غالب، 11۔ مہر نیمروز، 12۔ دستنبو، 13۔ سبد چین۔(1)

کلام غالب میں سب سے اہم حصہ شاعرانہ ندرت فکر کا ہے غالب کی تفکری تقلید کرنے والوں نے شاعری کو ہر جہت اور معنوی تنوعات کے تناظر میں کھوج کر عصری جدت طرز کو نمایاں کیا ہے۔ غالب کے بغائر مطالعے سے دیکھا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ انہوں نے شاعر اور شاعری کے بارے میں نئی معنویت کو اپنے خیالات سے سمیٹا۔ اردو شاعری چونکہ اپنی الگ روایت کی غمازی کرتی ہے۔ اس میں شعر گوئی اور قافیہ پیمائی ایک مستند استاد کی محتاج ہے۔ اسی روایت کے ساتھ کلام غالب کا مطالعہ بطور ایک استاد ہی کیا جا سکتا ہے۔ جو شعر گوئی کے ساتھ ہی شاعرانہ فن کی اصلاح کا باعث بھی بنتے ہیں۔ کیونکہ مرزا غالب نے نواب رام پور، بہادر شاہ ظفر، الطاف حسین حالی، منشی ہر گوپال تفتہ، میر مہدی حسین مجروح، منشی شیو نرائن آرام، نواب علاؤ الدین خاں اور دیگر کئی شاعروں کے کلام پر اصلاح دی۔ غالب نے فارسی اور اردو زبان، الفاظ کی موزنیت، تشبیہ، استعارہ تلازمات و تراکیب اوزان و بحور اور علم العروض کے ساتھ ادبی نکتوں پر تفصیلا بحث کی ہے۔ غالب زبان و اسلوب کے تمام قواعد و کے حوالے سے شاعرانہ وسعت پر سختی سے کاربند تھے۔ ڈاکٹر ایس ایم اکرام لکھتے ہیں:

"عشق غزل گو شعراء کا محبوب موضوع ہے اور غالب اس سے اچھوتا نہیں ہے۔ ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ عشق اور حیات غالب کی شاعری کے اہم موضوعات ہیں۔"2

کلام غالب سے واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے شاعری کسی انسان سے نہیں سیکھی بلکہ یہ ایک وہبی شعور کا نتیجہ ہے۔

مولانا الطاف حسین حالی یادگار غالب میں فخریہ انداز میں غالب کا قول یوں نقل کرتے ہیں۔

"میں خدا کے علاوہ کسی اور کا شاگرد نہیں ہوں"

فارسی شعر اسی کی ترجمانی ہے

مانبودیم بدیں مرتبہ راضی غالب

شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما3

غالب کو احساس شاعری اس کے خون کی گردش کی مانند تپش جنون سے مزین ملا ہے بقول حالی غالب نے کم عمری میں سچے پاکیزہ جذبات کی ترجمانی سے شعری حسن کو تراشا ہے وہ فطرت کے قریب تر تھے شعری لطافتوں کو دل کی آواز اور صداقت کے استعارے سے سلجھاتے ہوئے قدرت اور فطرت کی عکاسی کی ہے۔ چودھری عبدالغفور شعری تجربے کے ضمن میں لکھتے ہیں:

جسمانی اعضاء کی مدد سے شاعری کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس کے لیے دل، دماغ ایک ذوق اور ایک جذبے کی ضرورت ہے۔"4

سید رفیع الدین بلخی اپنی کتاب تجزیہء کلام غالب میں لکھتے ہیں۔

"خود معیاری چیزیں جو کسی شاعر کی عظمت یا مقبولیت کا سبب بتائی جاتی ہیں یعنی جذبات کی رفعت، خیالات کی بلندی اور عنوان نگارش کی دلپذیری سماج کی تابع ہیں۔ یہ چیزیں خود بھی حالات سے متاثر ہوتی ہیں۔ جن خیالات یا جذبات کو قدیم زمانہ میں ارفع و اعلی سمجھا جاتا تھا عہد وسطی میں ان کی کوئی جگہ باقی نہیں رہی اور خود عہد وسطی میں جو خیالات مقبول تھے۔ اب ان کی وہ حیثیت باقی نہیں رہی۔'5

کوئی بھی بڑی شاعری اپنی عظمت کا معیار عصری انفرادیت کے وسیلے سے متعین کرتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"غالب کی تمام مقبولیت و عظمت کا راز اسی میں ہے کہ وہ اس دور کی سرحد پر کھڑا تھا، جہاں ایک طرف جاگیر دارانہ عہد مغلیہ کا آفتاب غروب ہو رہا تھا اور دوسری جانب انگریزی سامراج اور مغربی سرمایہ داری کے ابھرتے ہوئے سورج کی کرنیں افق پر پھیل رہی تھیں۔ غالب کا کلام صرف آخری دور کے نظام اور اس کے تمام رجحانات ہی کا آئینہ دار نہیں بلکہ اس کشمکش کا بھی ترجمان ہے جو ایک عبوری دور میں ہوا ہے۔"6

مرزا غالب کی شاعرانہ عظمت اور مفکرانہ مقبولیت کو اردو شاعری کی روایت میں ہر عہد کے شعراء نے تسلیم کیا ہے خواہ وہ عظمت کسی بھی درجہ کی ہو۔ اس کا یہ مسلم ثبوت ہے کہ غالب کو اس جہاں سے گذرے سو سال سے زیادہ عرصہ چکا ہے مگر آج بھی ان کے کلام کی مقبولیت اور فلسفہء کی بیش از بیش اشاعت جاری ہے۔ مگر نئے عہد میں یہ سوال نئی معنویت کا آغاز ہے۔ غالب کی مقبولیت و عظمت میں کون سے اسباب اہم ہیں؟ اس کے ہم عصر شعراء کے سامنے اور بڑے شعراء میں اس کا درجہ کیا ہے؟ اور دوسرے فارسی اور انگریزی ادب میں اس کا مقام کیا ہے؟

اسلوب احمد انصاری لکھتے ہیں:

"غالب اردو شاعری کا ایک نادر مظہر ہیں ان کی انفرادیت اور عظمت اتنے متضاد پہلوؤں میں اجاگر ہوئی ہے کہ ان سب کا احاطہ کسی ایک شخص کے لئے ایک مضمون کی محدود بساط میں کرنا مشکل ہے فکر و فن کی محفل میں فن کا مقام اور منصب سب سے الگ ہی نہیں سب سے نمایاں اور بلند بھی ہے۔7

غالب عہد ساز شاعر ہیں، اپنی مخصوص انفرادیت کے باعث اردو شاعری کی تاریخ میں انہیں بہت اہم مقام حاصل ہے۔ انکی مقبولیت کی سب سے اہم وجہ جدت پسندی ہے۔ جدیدیت بحیثیت مجموعی ادب میں ایک مثبت تحریک ہے۔ جو ایک فعال اور تخلیقی اعتبار سے زرخیز فرد کی آواز ہے غالب ان معنوں میں جدید ہیں کہ وہ ایک طرح نو کے مبلغ اور ایک نئے عہد کے علم بردار ہیں۔ ایک جاگیر دارانہ نظام اور ایک منجمند معاشرے کا حصہ ہونے کے باوجود انہوں نے ماحول کی گھٹن سے برگشتگی کا اظہار کیا اور ایک نئے عہد کو تخلیق کرنے کی خواہش کی وہ اپنی ذہنی اور جذباتی صلاحیتوں سے واقف تھے اور اپنی طباعی اور جدت طراز طبعیت کا عرفان رکھتے تھے اور قدم قدم پر اپنے ماحول کی سنگلاخیت اور افراد کی بھیڑ چال میں اثبات ذات کا اظہار کرنے پر خود کو مجبور پاتے تھے۔ ان کے کلام میں نئے فرد کی آواز صاف سنائی دیتی ہے۔

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد — سرگشتہ خمار رسوم و قیود تھا
تالیف نسخہء ھائے وفا کر رہا تھا میں — مجموعہء خیال ابھی فرد فرد تھا
دریائے معاصی تنک آبی سے ہوخشک — میرا سر دامن بھی تر نہ ہوا تھا
منظر اک بلندی پر اور ہم بنا سکتے — عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا۔8

جدیدیت کا ایک اہم امتیازی وصف روح عصر سے آشنائی ہے۔ جو شعراء اس سے بہرہ مند ہوتے ہیں ان کے کلام میں ایک ایسی وسعت فکر اور واضح کیفیت پیدا ہوتی ہے جس سے محدود علم رکھنے والے اور ایک محدود ماحول میں زندگی بسر کرنے والے شعراء عموماً محروم ہوتے ہیں۔ غالب روح عصر سے آشنائی کے اعتبار سے اپنے دور کے باقی شعراء سے بالکل الگ اور ممتاز دکھائی دیتے ہیں حالانکہ ان کے اپنے

زمانے میں یہ شعور ابھی پوری طرح پیدا نہیں ہوا تھا، مغل حکومت کے زوال کے باوجود مغرب کا وہ انداز نظر جو انفرادیت، بغاوت اور اجتہاد کو تحریک دیتا ہے معاشرے میں نمودار نہیں ہوا تھا اس کے باوجود غالب کے بے شمار اشعار مزاج، لہجے اور علامات کے اعتبار سے جدید ہیں۔

زمانہ عہد میں اس کے ہے محو آرائش — بنیں گے اور ستارے اب آسماں کے لیے

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے — نالہ پابند نے نہیں ہے

دل ہی تو ہے سیاست درباں سے ڈر گیا — میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کئے۔9

اسلوب کے اعتبار سے بھی غالب اپنے زمانے کی نسبت جدید دور سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں اس کے ساتھ ساتھ روایت سے بھی استفادہ کرتے ہیں اس کے اثر سے نہ صرف اپنے فن میں رنگینی اور رچاؤ کی خصوصیات پیدا کی ہیں بلکہ بعض ایسے پہلو بھی اس میں نمایاں ہو گئے ہیں جن کی وجہ سے نہ صرف غالب کے فن میں بلکہ خود صنف غزل کے فن میں ایک نئے رنگ و آہنگ نے اپنی جگہ بنالی ہے وہ نہ صرف اردو کی ادبی روایت سے بلکہ فارسی کی پوری ادبی روایت سے آگاہ تھے۔ انہوں نے روایت کی پیروی کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے فن کو بعض نئے تجربات سے بھی آشنا کیا۔ یہ تجربات اسلوب کی سطح پر بھی کئے گئے اور نظریات کی سطح پر بھی۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں توازن ہے اور ان کی جڑیں روایت کی زمین میں پوری طرح پیوست ہیں۔ کیونکہ غالب نے اپنے تجربے کو روایت کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ کیا ہے اسلئے ان کے فن میں اس کی ایک مستقل حیثیت نظر آتی ہے۔ باالفاظ دیگر انہوں نے اپنی شعری روایات کو نہ تو من و عن قبول کیا نہ یکسر بغاوت کی۔ جو چیزیں ان کے لیے قابل قبول تھیں انہیں اختیار کر لیا جو پسند نہ ائیں انہیں بلا تامل رد کر دیا۔ روایت اور جدت کے اسی امتزاج کے باعث غالب کے ہاں مشکل گوئی کا رجحان نمایاں ہے اگرچہ ان کے زمانے سے موجودہ زمانے تک ان کی مشکل گوئی پر بہت کچھ کہا گیا لیکن اسے صحیح تناظر میں دیکھنے کی کوشش بہت کم کی گئی۔

پروفیسر ال احمد سرور لکھتے ہیں

> 'زندگی سادگی سے پیچیدگی کی طرف سفر کرتی ہے، شاعری زندگی کا آئینہ ہے چنانچہ یہی حال اس کا ہے ہر زبان کی شاعری ابتدا میں سادہ اور اکہری ہوتی ہے اسے سمجھنے کے لئے کسی غور و فکر کی ضرورت نہیں ہوتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ زندگی پیچیدہ اور پیچیدہ تر ہوتی جاتی ہیں یہی پیچیدگی شاعری میں بھی راہ پاتی ہے۔ اسے سمجھنے اور لطف اندوز ہونے لئے غور و فکر کی ضرورت ہوتی ہے۔"10

میر کی شاعری پہلی قسم کی ہے اور غالب کی دوسری قسم کی۔ غالب کی مشکل پسندی دراصل زندگی کی پیچیدگی کی ترجمانی کرتی ہے۔ زندگی کو اس کی تمام تر پیچیدگیوں کے ساتھ شعر میں سمو لینا آسان نہیں صرف بڑا اور سچا شاعر اس سے عہدہ براہ ہوتا ہے۔ غالب نے کم سے کم الفاظ میں زیادہ سے زیادہ کہنے کا ہنر سیکھ لیا۔ اور ان کی مشکل گوئی محض ذہنی ورزش نہ رہی تو ابہام بھی ابلاغ کا فریضہ انجام دینے لگا۔ غالب کی امتیازی خصوصیت ان کا تفکر ہے۔ یہ تفکر ان کے بے چین اور عمیق ذہن کا رد عمل ہے وہ زندگی کے بارے میں گہری نگاہ اور واضح نظریات رکھتے تھے۔ جب ان کا تجربہ ان کے نظریات سے متصادم ہوتا ہے تو ان کی شاعری میں سوچ اور فکر کے عناصر جنم لیتے ہیں۔

اسلوب احمد انصاری یوں رقمطراز ہوتے ہیں:

"غالب کے یہاں تفکر ان تمام جذبوں کا اظہار ہے جو ذہن اور روح کی گہرائیوں میں جذب ہو کر ابھرے ہیں اس فکر کی قدر و قیمت کے تعین ان تجربات کے تجزیے پر منحصر ہے۔ حسرت بھی اچھے اور دلپذیر شاعر ہیں ان کے یہاں بھی جذبات کی بو قلمونی اور فراوانی ملتی ہے مگر برنز کی طرح وہ خالص تجربے سے آگے نہیں بڑھتے ان کی شاعری صرف احساسات کی آہنگ عطا کرتی ہے اور انہیں آسودگی بخشتی ہے اس اعتبار سے کیٹس کی نہایت ابتدائی دور کی شاعری ہی تک پہنچ کر رہ جاتی ہے۔ غالب کے یہاں رنگارنگی اور فراوانی سے زیادہ ندرت پیچیدگی اور تنوع اہم ہے ان کے یہاں جذبات کی تندی اور ذہن کی برق رفتاری بیک وقت ملتی ہے ان کی شاعری میں تعقل کا عنصر دوسرے تمام عناصر پر فوقیت رکھتا ہے۔"11

غالب کو فلسفی شاعر ان معنوں میں تو نہیں کہا جا سکتا جن بنیادوں پر ہم یہ اصطلاح اقبال کے لئے استعمال کرتے ہیں کیونکہ غالب نے کسی مرتب یا منضبط فلسفیانہ نظام کا سہارا نہیں لیا نہ ان کی شاعری کا محرک کائنات کا کوئی دوسرا فلسفیانہ تصور ہے۔ نہ ہی غالب کے لئے نظام فکر یا زندگی کی کوئی تفسیر مکمل اور بصیرت افروز تجربہ بن سکی۔ اس لئے ان کی شاعری ان تعمیمات کی فنی ترسیل ہے جو انہوں نے نجی تجربات سے اخذ کی ہیں۔ وہ عنیت پسند اور صوفی مشرب تھے ان کا متجسس اور خلاق ذہن کائنات اور انسانی زندگی کے مسائل کی گرہ کشائی میں لگا رہتا تھا گو ان کے یہاں انہی فلسفیانہ نظریوں کا شعور اور عکس ملتا ہے جو انہوں نے طوسی، بو علی سینا، غزالی، عراقی، جامی اور رومی سے ذہنی ورثے کے طور پر پائے تھے اور ان کے کلام پر فلسفہ اور تصوف کے ان مہتم بالشان مسائل کی پرچھائیاں نظر آتی ہیں جو فارسی شاعری کے خمیر میں رچ بس گئی۔ غالب کے یہاں فلسفیانہ نظام نہیں فلسفیانہ افتاد فکر اور انداز بیان ملتا ہے، ان کے اشعار کی معنویت اور فنی لطافت ذہن انسانی کو دعوت فکر دیتی ہے۔ غالب کے یہاں بعض معینہ اقدار اور ان تصورات کا سہارا لیتے ہیں جو فارسی شاعری اور فلسفے میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں جس میں نو فلاطونی عقیدے بھی جذب ہو گئے تھے۔

جز نام نہیں صورت عالم مجھے منظور — جز وہم نہیں ہستی اشیاء میرے آگے
ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسد — عالم تمام حلقہء دام خیال ہے
ھاں کھائیو مت فریب ہستی — ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے12

غالب کے یہاں فلسفیانہ خیالات کی بہت سی تہیں ملتی ہیں۔ ان کے یہاں چونکہ تعقل پر زور ہے اس لئے تو مطلق کا عقیدہ بھی ملتا ہے۔ حقیقت کے مادی تصور سے اس زمانے کا فلسفیانہ نظام آشنا نہیں تھا۔ اس کا روحانی پہلو مادی کی نسبت اہم تر تھا۔ چنانچہ غالب کا خیال ہے کائنات کا ادراک عقل ربانی کی مدد کے بغیر ممکن نہیں۔ آخری حقیقت کے ادراک کے لئے صرف عقل کی رہنمائی کافی نہیں بلکہ انسانیت کی شکست بھی ضروری ہے۔

؎ کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے — پردہ چھوڑا ہے وہ اس نے کہ اٹھائے نہ بنے
؎ ہر چند سبکدست ہوئے بت شکنی میں — ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور
؎ ہے کائنات کو حرکت ترے ذوق سے — پرتو سے آفتاب کے ذرے میں جان ہے۔13

غالب نے فنا کی فلسفیانہ تعبیر و توجیح کرنے کی کوشش کی ہے۔ فنا کا لفظ ان کے کلام میں ایک ایسے بلیغ اشارے کی حیثیت رکھتا ہے۔

جس سے معنی و مفہوم کی بہت سی تہیں وابستہ ہیں اسے ایک طرح کا تحت نغمہ بھی کہا جاسکتا ہے جس کی گونج بار بار سنائی دیتی ہے دوسری سطح پر یہ سیاسی نظام کے زوال کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے۔ ہستی کو نیستی بنانے والے عوامل اور مرکز سے علیحدہ کر کے اس کے وجود کو معرض خطر میں ڈالنے والے عناصر فن سے ہی عبارت ہیں۔

؎فنا کو سونپ کر مشتاق ہے اپنی حقیقت کا فروغ طالع خاشاک سے موقوف گل فن پر

؎عشرت قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا ہے

؎نظر میں ہے ہماری جادہء راہ فنا غالب کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا۔14

وحدت الوجود کے عقیدے کو غالب کے تفکر میں بہت اہمیت حاصل ہے اس عقیدے کی بنیاد یہ ہے کہ کائنات خدا سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتی وجود صرف ایک ہے وہ وجود جب تعینات کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے تو ممکنات کے اقسام اور مدارج پیدا ہوتے ہیں وجود حقیقی اور کائنات کے مابین ذات وصفات کی گہری نسبت ہے چونکہ صفات عین ذات ہیں اس لئے کائنات حق تعالی سے ممیز نہیں اصل حقیقت وہ اکائی ہے موجودات کی کثرت کے پیچھے چھپی ہوئی ہے۔ زندگی کی ابتدا اور انتہا خدا کی ذات پر منتج ہے اس لئے مادی زندگی کے بااعتباری ہونے میں شبہ نہیں، مخلوق کا تصور خدا کے تخلیقی تصور میں موجود اور مضمر ہے اس لئے ہستی بالذات کوئی معنی نہیں رکھتی۔ غالب کے دل میں وحدت الوجود کا عقیدہ اس درجہ راسخ تھا کہ وہ بعض اوقات مشاہدے اور کشف والہام کی ضرورت پر بھی شک کرنے لگتے ہیں۔ جب ہر شے کی حقیقت ایک ہی ہے اور تمام اشیاء ایک ہی ذات کا مظہر ہیں، تو پھر عرفان حق کی مختلف منزلوں میں یقین کیوں رکھیں۔

؎اصل شہود و شاہد مشہود ایک ہیں حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

؎کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم کر دیا کافر ان اصنام خیالی نے مجھے

؎نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں کیا ہوتا

؎دل ہر قطرہ ہے ساز انا البحر ہم اس کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا

؎ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر یاں کیا دھرا ہے قطرہ موج و حباب میں 15

وحدت الوجود کے عقیدے کی اصل روح اور آخری غایت تزکیہ نفس اور تصفیہ باطن ہے۔ غالب نے اسے عملی زندگی میں نہیں برتا تھا ۔ پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ محض روایت پرستی کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلے میں احتشام حسین کا یہ خیال بڑی حد تک صحت پر مبنی معلوم ہوتا ہے کہ

> "وحدت الوجود کی طرف غالب کا میلان مسائل حیات کو سمجھنے اور مذہب کی ظاہر داریوں سے بچ نکلنے کا ایک بہانہ تھا۔ غالب جس سماج کے فرد تھے اس سماج میں باغیانہ میلان اور آزادی کا جذبہ داخلی طور پر تصوف ہی میں نمایاں ہو سکتا تھا۔"16

دوسرا بڑا سبب اس فلسفے کے ماننے والوں کے نزدیک خدا تو نور ہے یا حسن ہے اس لئے اس کا ادراک مادی محسوسات کی دنیا میں ہی کیا جا سکتا ہے۔ پھر حسن اظہار کا مقتضی ہے اس لئے دنیا کا عالم عدم سے پردہ وجود پر نمایاں ہو جانا لازمی امر ہے۔ یہ عین قرین قیاس ہے کہ حقیقت کا ایسا

نظریہ جو کائنات کے رنگارنگ اور کثیر التعداد ظاہر کی توجیہہ حسن ازلی کے آرائش جمال کے دائمی جذبے کی روشنی میں کرے ان کے لئے بہت پرکشش تھا ذیل اشعار اسی خیال میں ادا ہوئے۔

؎آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

؎وہی بدمستی پر ذرہ کا خود عذر خواہ جس کے جلوے سے زمیں تا آسماں سرشار ہے

؎نظارہ کیا حریف ہو اس برق حسن کا جوش بہار جلوے کو جس کے نقاب ہے

؎لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا17

کلام غالب میں مادی زندگی کی رنگارنگ دلفریبیوں کی تحسین کا جو جذبہ جگہ جگہ نظر آتا ہے وہ براہ راست وحدت الوجود میں عقیدے کے پہلو سے منطبق کیا جا سکتا ہے۔غالب کے یہاں عقیدے کی خالص مذہبی تعبیر ہی نظر نہیں آتی بلکہ فطرت کے حسن کے پہلو بھی نمایاں ہیں۔ غالب شہری زندگی کی نفاستوں، ہنگاموں اور اس کے نقش ہائے رنگ رنگ سے قریب تھے۔اور انہوں نے فطرت کے خاموش حسن کو محسوس نہیں کیا تھا اس کے باوجود اپنے کلام میں انہوں نے فطرت کے حسن لازوال کے مناظر کا ذکر جس صنعت کاری اور سلیقے کے ساتھ کیا ہے اور اس میں جو نکتہ آفرینیاں کی ہیں اس سے ایک طرف تو ان کے گہرے جمالیاتی احساس اور خلاق تخیل کا ثبوت ملتا ہے۔اور دوسری طرف زندگی کی حسین چیزوں کے لئے اس حرص کا جو ان کی شخصیت کا ایک اہم جزو تھی۔وحدت الوجود کا عقیدہ انہیں جس حسن پرستی کی طرف لے گیا اس کی کچھ کچھ خبر ان اشعار سے ملتی ہے۔

؎پھر اس انداز سے بہار آئی کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنان خطہء خاک اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر روکش سطح چرخ مینائی

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی بن گیا روئے آب پر کائی۔18

غالب نے اپنے حکیمانہ مزاج کے باوجود اپنے کلام میں شاعرانہ انداز بیان کو برقرار رکھا ہے۔مجرد تصورات کی شاعری عام طور پر سپاٹ ہوتی ہے۔مگر غالب کے یہاں ایسی شاعری میں بھی جذبہ کی داخلیت توانائی اور شدت موجود ہے۔وہ جذبے اور ذہنی تصورات کے درمیان رشتہ قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ خیالات کو حسیات میں اور مشاہدات کو ذہنی کیفیات میں تبدیل کرنے کی صلاحیت بدرجہ اتم رکھتے ہیں۔ اسلوب احمد انصاری کا کہنا ہے کہ:

"فکر اور جذبے کے جیسا سچا اور حسین امتزاج اور تخلیقی پیکروں میں میناکاری اور قوس قزح کی جو بہاریں ہمیں غالب کے یہاں نظر آتی ہیں اس کی مثال اردو کے کسی دوسرے شاعر کے یہاں نہیں ملتی، ان کے بہترین اشعار وہی ہیں جہاں تجربات کا بیان ذہن کو منور کرتا چلا جاتا ہے اور جہاں فکر اور جذبے کے عمل اور رد عمل کا پتہ چلتا ہے۔"19

؎کیا آئینہ خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے کرے جوں پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا

؎نہ ہو گا یک بیاباں نمائندگی سے ذوق کم میرا حباب موجہء رفتار ہے نقش قدم میرا

ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال — خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک — بے اختیار دوڑے ہے گل در قفائے گل۔20

غالب کی شاعری کے تعقلی رجحان کا ایک مظہر تو وہ استدلالی انداز بیان ہے جس کی وضاحت اس کے اکثر اشعار سے ہوتی ہے۔ اس کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان کے یہاں اکثر جگہ قول محال کا استعمال ملتا ہے۔ جس سے مراد یہ ہے کہ کسی حقیقت کا اظہار اس صورت سے کیا جائے کہ بظاہر مفہوم عام رائے کے خلاف نظر آئے اور بادی النظر میں قابل قبول نہ معلوم ہو لیکن پھر غور کیا جائے تو یہ مفہوم مکمل اور معنی خیز ہو۔ یہ بھی ایک طرح کی ذہنی ریاضت ہے اور جہاں اس سے شاعر کی قوت فکر نمایاں ہوتی ہے وہاں شاعر قاری سے بھی ایک نوع کی دماغی کاوش اور مشقت کا طالب ہوتا ہے یہ عین ممکن ہے کہ دوئم درجے کی صلاحیت رکھنے والے فن کار کے ہاتھ میں یہ ملکہ مقصود بالذات بن جائے۔ لیکن غالب کے جہاں اس فنی تدبر کے استعمال سے بعض لطیف حقائق کا انکشاف ہوتا ہے وہاں وہ حیرت و استعجاب کی کیفیت ابھارنے میں بھی کامیاب ہوتے ہیں ان کے یہاں فکر کی بیباکی اور رعنائی کے مختلف پہلو اس سلسلے میں اس طرح سامنے آتے ہیں۔

کم جانتے تھے ہم بھی غم عشق کو پر اب — دیکھا تو کم ہوئے پہ غم روزگار تھا

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا — آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

ہم کو ستم عزیز ستم گر کو ہم عزیز — نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں تو سہل ہے — دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں 21

اس رجحان کا تیسرا پہلو وہ تشکیک ہے جو بحیثیت مجموعی غالب کی شاعری کے رگ و پے میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ اس کا ایک ماخذ تو غالب کا وہ فلسفیانہ مزاج ہے جو کائنات کے اس اسرار رموز کی عقدہ کشائی کسی خاص نظریے کا سہارا لے کر نہیں کرنا چاہتا بلکہ جو حقیقت کی ذاتی تاویل اور اقدار کی شخصی تشکیل کی جد وجہد میں مصروف رہتا ہے۔ دوسرا ماخذ اس تشکیک کا ہمیں غالب کے دور کے تاریخی تقاضوں میں تلاش کرنا چاہیے غالب کا زمانہ انتشار عدم توازن اور حیرت انگیز انقلابات کا زمانہ تھا۔ پرانا جاگیر داری نظام دم توڑ رہا تھا۔ مغرب کا سرمایہ دارانہ نظام اس کی جگہ لے رہا تھا۔ غالب اپنے دور سے نا آسودہ بھی تھے اور نئی تبدیلیوں کا خیر مقدم بھی کرتے تھے لیکن پھر بھی ان کے آئینہ ادراک میں مستقبل کی تعمیری صورت پوری طرح جلوہ فگن نہیں ہوئی تھی۔ ان کے کلام میں اس کا نتیجہ ایک وحدت پسند ادراک کی صورت میں نمایاں ہوا۔

یارب زمانہ مجھ کو مٹاتا ہے کس لیے — لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

جان کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دم سماع — گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں — غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے۔22

مرزا غالب کے یہاں احساس اور تخیلی پیکر کے درمیان جو مکمل ہم آہنگی تطابق و توافق پایا جاتا ہے۔ اس کے مماثل ایک خصوصیت یہ ہے کہ غالب نکتہ آفرینی کے بھی بڑے دلدادہ اور ماہر ہیں۔ بات سے بات پیدا کرنا بھی فعال ذہن کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔ ذہن کو ایک خیال سے دوسرے خیال تک پہنچاتا اور مختلف تخیلی پیکروں کو ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح مربوط کرنا کہ ان کا مجموعی تاثر وحدت کا تاثر ہو۔ آسان کام نہیں نکتہ آفرینی کی دو قسمیں ہیں ایک لفظی اور دوسری معنوی۔ لفظی نکتہ آفرینی کا محرک صرف اپنی سطحی قسم کی برتری اور سبقت کا

احساس ہوتا ہے معنوی نکتہ آفرینی کا مقصد تجربے کے متضاد، مخالف اور پیچیدہ عناصر اور پہلوؤں کا ادراک کرنا اور انہیں اپنے شاعرانہ شعور میں سمو کر اس طرح پیش کرنا کہ اس سے قاری کے ذہن میں جو دت پیدا ہو۔ غالب کے یہاں لفظی نکتہ آفرینی کی نسبت معنوی اہمیت پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ وہ ایک خیال یا تاثر کے مختلف پہلوؤں کو اظہار بیان کی گرفت میں اس طرح لاتے ہیں کہ کسی قسم کی تعقید پیدا نہیں ہوتی۔ یہ ان کی ذہنی فعالیت کی دلیل بھی ہے اور اس کی فنی پختگی کی بھی۔

؎ سراپا رہن عشق و ناگزیر الفت ہستی — عبادت برق کی کرتا ہوں افسوس حاصل کا
؎ بسکہ ہوں غالب اسیری میں بھی آتش زیر پا — موئے آتش دیدہ ہے حلقہ میری زنجیر کا
؎ نہ ہو حسن تماشا دوست رسوا بے وفائی کا — بہ مہر صد نظر ثابت سے دعوی پارسائی کا
؎ رگ وپے میں جب اترے زہر غم تب دیکھیے کیا ہو — ابھی تو تلخیء کام و دھن کی آزمائش ہے 23

کلام غالب میں جو معنوی گہرائی اور تہہ داری نظر آتی ہے اس میں الفاظ کے فنی برتاؤ کا بڑا حصہ ہے۔ انہوں نے الفاظ و تراکیب کو کچھ ایسی صناعی اور کچھ ایسے حسن التزام کے ساتھ استعمال کیا ہے کہ ان کا ایک ایک لفظ فی الواقع گنجینہء معنی کا طلسم بن گیا ہے۔ اس کی تخلیق میں انہوں نے علم بیان و بدیع کی ساری لفظی و معنوی صنعتوں حتی کہ اردو شاعری کی بدنام ترین صنائع لفظی ابہام اور تناسب لفظی سے بھی جگہ جگہ کام لیا ہے۔ لیکن اس خوبی اور فنکاری کے ساتھ کہ کہیں ایک جگہ بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ کسی لفظ یا ترکیب کی کسی خاص رعایت یا التزام کے ساتھ استعمال کر رہے ہیں۔

؎ تاکہ تجھ پر کھلے اعجاز ہوائے صیقل — دیکھ برسات میں سبز آئینے کا ہو جانا
؎ شور پند ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا — آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا
؎ بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل — جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا
؎ میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بار تھا — میری آہ آتش سے بال عنقا جل گیا 24

غالب نے صنعتوں کا استعمال محض صنعتوں کی تخلیق کے لئے نہیں کیا بلکہ معنی کی توسیع کے لئے کیا ہے۔ یہ محض الفاظ کی بازی گری کے لئے نہیں لائی گئیں، بلکہ فکر و خیال کی مناسب و معنی خیز لفظی پیکر دینے کے لیے خود بخود کلام میں در آئی ہیں اور اس خوش اسلوبی کے ساتھ کہ ان کی بدولت اشعار میں معنوی تہہ داری اور دل کشی کے وسیع امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ کم بیش یہی کیفیت ان کے سارے کلام کی ہے وہ اپنے افکار و خیالات کے اظہار میں ایک ایک لفظ کو نگینے کی طرح اشعار میں ایسی صناعی اور فن کاری کے ساتھ جڑتے ہیں کہ ان کی قدر و قیمت دوچند ہو جاتی ہے۔ یہ کام کہیں وہ شعر کے بعض ٹکڑوں سے لیتے ہیں اور کہیں شعر کے مجموعی لہجے سے بلکہ کہیں کہیں وہ الفاظ کے ایسے ٹکڑے رکھ دیتے ہیں کہ اشعار میں دو متضاد معنی پیدا ہو جاتے ہیں اور بیک وقت دونوں معنی قابل قبول ہوتے ہیں۔

؎ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا
؎ زندگی میں تو وہ محفل سے اٹھا دیتے تھے — دیکھوں اب مر گئے پر کون اٹھاتا ہے مجھے
؎ کیوں کر اس بت سے رکھوں جاں عزیز — کیا نہیں ہے مجھے ایماں عزیز۔ 25

یہ اشعار معنوی اعتبار سے پہلو دار ہیں۔ مگر کسی شعر کا ایک معنی دوسرے معنی کی ضد نہیں۔ اس لیے ان اشعار کی ذو معنویت شعر کے کسی ایک ٹکڑے کی نہیں اس کے مجموعی لہجے کی مرہون منت ہے۔ ظاہر ہے کہ لہجے کا تعلق فکر و خیال کی جدت سے نہیں الفاظ کے دروبست سے ہے اور اسی دروبست نے ان اشعار میں دوہرے معنی پیدا کئے ہیں۔ اس قسم کے اشعار کو غالب کی قوت گویائی کا اعجاز کہنا چاہیے۔ کیونکہ کلام غالب میں بے شمار اشعار ایسے ملتے ہیں جن کی تفسیر فلسفیانہ سیاسی اور شخصی سطح پر بیک وقت کی جاسکتی ہے۔ انہی کو ذہن میں رکھتے ہوئے غالب کی شاعری کو پہلو دار کہا جاسکتا ہے۔

؎دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں — آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا
؎دل تا جگر کہ ساحل دریائے خوں ہے اب — اس رہ گزر میں جلوہء گل آگے گرد تھا
؎کچھ نہ کی اپنے جنوں نارسانے ورنہ یاں — ذرہ ذرہ روکش خورشید عالمتاب تھا26

غالب کے اس قسم کے اشعار سے بحث کرتے ہوئے حالی یادگار غالب میں لکھتے ہیں:

"مرزا کے طرز ادا میں ایک خاص چیز ہے جو اوروں کے یہاں بہت کم دیکھی گئی ہے۔

اور جس کو مرزا اور دیگر ریختہ گویوں کے کلام میں مابہ الامتیاز کہا جاسکتا ہے۔ ان کے اکثر اشعار کا بیان ایسا پہلو دار واقع ہوا ہے کہ بادی النظر میں اس کے کچھ اور معنی مفہوم ہوتے ہیں مگر غور کرنے کے بعد اس کے کچھ اور معنی نیا پن احساس لطیف پیدا ہوتے ہیں جن سے وہ لوگ جو ظاہری معنوں پر قناعت کر لیتے ہیں لطف نہیں اٹھاسکتے۔"27

اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ان کے اشعار میں جو لفظ آگے ہے وہ معنوی اعتبار سے عموماً کھرا یا سادہ نہیں بلکہ ان کے فلسفیانہ مزاج اور اختراع پسند طبعیت کے سبب قدرے پیچیدہ اور پرت در پرت ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار کا مفہوم الفاظ کی سطح پر نہیں بلکہ ان کی تہہ میں ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے الفاظ و تراکیب پر جتنا غور کیا جائے اسی قدر ان کی گرہیں کھلتی جاتی ہیں۔ اور معنی کا دائرہ وسیع سے وسیع تر اور عمیق سے عمیق تر ہو جاتا ہے۔ اس فنی عمل کے لئے صنائع لفظی و معنی کے سوا وہ مثال و استعارات سے بھی اکثر کام لیتے ہیں۔

؎آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا — ہر کوئی درماندگی میں نالہ سے ناچار ہے
؎دم لیا نہ تھا قیامت نے ہنوز — پھر ترا وقت سفر یاد آیا
؎پنہاں تھا دام سخت قریب آشیانے کے — اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے۔28

ڈاکٹر فرمان فتحپوری لکھتے ہیں:

"غالب کے اکثر اشعار کا موضوع اور خیال ایسا اچھوتا نہیں ہوتا کہ اس کی مثال اردو فارسی کے شعراء کے یہاں نہ ملتی ہو۔ لیکن غالب نے انہیں جس قسم کی مثالوں اور استعاروں کے ذریعے پیش کیا ہے وہ اردو میں بالکل نئی چیز ہے ان کے ذریعے کلام غالب کے طلسم معنی کو وسعت بھی ملی ہے لیکن طلسم معنی کے اجزائے ترکیبی میں ایک اور عنصر بھی شامل ہے ادب کی اصطلاح میں اسے مقدر کہتے ہیں مقدر سے مراد کلام کے وہ مخذوب اجزاء ہوتے ہیں جنہیں قاری کا ذہن سیاق و سباق کے قرائن سے خود بخود اخذ کر لیتا ہے۔ کلام غالب میں اس کی خوب صورت مثالیں ملتی ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ ان کی ایجاز

نویسی اور معنی میں مقدرات کو خاصا دخل ہے۔"29

؎مجھ تک ان کی بزم میں آتا تھا دور جام ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں

؎یہ کہہ سکتے ہو ہم دل میں نہیں ہیں پر یہ بتلاؤ کہ جب دل میں تمہیں تم ہو تو آنکھوں سے نہاں کیوں ہو30

غالب نے اپنے اشعار کو گنجینہء معنی کا طلسم بنانے میں صرف فکر و خیال کی جدت ہی سے نہیں زبان و بیان کے جملہ محاسن سے بھی کام لیا ہے۔ استعارات و مقدرات، صنائع بدائع لفظی معنوی کے ساتھ جس چیز نے ان کی ایجاز نویسی کو اعجاز نویسی کی حدود میں داخل کیا ہے وہ صنعت تلمیح ہے، تلمیح پوری ایک داستان یا واقعہ کے لئے اشارے اور علامت کے کام دیتی ہے۔ اور شاعر ان کی مدد سے الفاظ کے کوزے میں معنی کا دریا بند کر دیتا ہے۔ مثلاً دیوان غالب کے اس مطلع کو لیجیے۔

؎نقش فریادی ہے کس کی شوخیء تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا۔31

اس مطلع سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ غالب نے اپنے کلام میں تلمیحات سے کیا کام لیا ہے۔ اور انہوں نے ان کے کلام کو کس طرح ایک جہان معنی سے آشنا کیا ہے۔ اگرچہ غالب کی تلمیحات کا کینوس زیادہ وسیع اور کچھ متنوع نہیں ہے زیادہ تر اردو کی عام تلمیح روایات مثلاً لیلی مجنوں، شریں فرہاد، یوسف زلیخا، حضرت عیسی، موسی، خضر، جام جمشید، اور منصور حلاج کے تاریخی و نیم تاریخی اور سینہ بہ سینہ محفوظ قصوں سے اپنا کام نکالا ہے مگر جس نئی روایات کی بناء ڈالی ہے بالکل اسی طرح تلمیح روایات کی بھی نئی سمتوں اور نئے معنوں سے آشنا کر کے تجدد کی راہ دکھائی ہے۔

؎جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار صحرا مگر بہ تنگی چشم حسود تھا

؎کو ہکن نقاش یک تمثال شیریں تھا اسد سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

؎لب عیسی کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی قیامت کشتہء لعل بتاں کا خواب سنگین ہے۔32

کلام غالب کی اہم خصوصیت رمز بلیغ کا برتنا ہے۔ اس فنی اصطلاح کا مفہوم یہ ہے کہ کسی تاثر، جذبے یا خیال کی تشریح کے لئے دو ایسی اشیاء کے درمیان مشابہت اور مماثلت قائم و ظاہر کی جائے جو بادی النظر میں ایک دوسرے سے بہ مراحل دور ہوں لیکن جن میں ایک اندرونی ربط متعین کیا جا سکے۔ رمز بلیغ کی بنیاد ذہن کی درا کی پر زیادہ اور مماثلتوں کے دوٹوک صحیح ہونے پر کم ہے۔ ڈاکٹر جانسن نے رمز بلیغ کی تعریف یوں کی ہے:

"غیر مشابہ تخیلی پیکروں کے مجموعہ ہے یا ان اشیاء کے درمیان جو بظاہر مختلف ہوں، مخفی مشابہتوں کی تقدیس ہے۔"33

جذبے اور تخیلی پیکر کے درمیان خلاف معمول رشتہ قائم کرنے کے لئے شاعر اپنے حافظے کو کنگالتا ہے۔ اور دور و نزدیک کی اشیاء کو بالمقابل جمع کر دیتا ہے۔ رمز بلیغ میں اشاریت، حسن آفرینی اور اختصار و بلاغت پر عناصر پائے جاتے ہیں۔ مبالغہ تو رمز بلیغ کی ہیت ترکیبی میں شامل ہے اور ایک طرح کا تناؤ اور تذبذب بھی۔ مگر اس کے عقب میں فشار کی جو کیفیت پائی جاتی ہے۔ وہ بھی اسی قدر ضروری ہے۔ اس سے قارئین کے اذہان و ادراک میں جو ایک نوع کی جودت اور تنویر پیدا ہوتی ہے۔ کلام غالب میں پیچیدہ مگر کامیاب رمز بلیغ کی مثالیں ملتی ہیں۔

؎ہیں بسکہ جوش بادہ سے شیشے اچھل رہے ہر گوشہء بساط ہے سر شیشہ باز کا

؎خانہ ویران سازی حیرت تماشا کیجیے صورت نقشِ قدم ہوں رفتہ رفتار دوست
؎چھڑکے ہے شبنم آئینہ برگ گل پہ آب اے عندلیب !وقت وداع بہار ہے
؎پیکر عشاق ساز طالع ناساز ہے نالہ گویا گردش سیارہ کی آواز ہے۔34

لیکن اگر رمز بلیغ میں تخیل کی کار فرمائی پوری طرح موجود نہ ہو اور تخیلی پیکر اور احساس کے درمیان سچا امتزاج پیدا نہ ہو سکے تو پھر وہ ایک طرح کی عالمانہ سخن سازی یا تکیہء فن بن جاتی ہے۔ غالب کے یہاں اس تنزل یافتہ رمز بلیغ کی مثالیں نایاب نہیں ہیں۔ گو اس سے ان کی قادر الکلامی پر کوئی حرف نہیں آیا۔

؎میں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارھا میری آہ آتشیں سے بال عنقا جل گیا
؎میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولی برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا
؎مری ہستی فضائے حیرت آباد تمنا ہے جسے کہتے ہیں نالہ وہ اسی عالم کا عنقا ہے
؎بدگماں ہے مجھ سے کہ آئینے میں مرے طوطی کا عکس سمجھے ہے زنگار دیکھ کر۔35

کلام غالب کی اسلوبیاتی خوبیوں میں ایک اہم خصوصیت تازہ و شگفتہ استعاروں، تشبیہوں اور تراکیب کی فراوانی ہے۔ ان کے تجربات ایک انفرادی شان رکھتے ہیں اس لئے انہوں نے ان کو شعر کے قالب میں ڈھالنے کے لیے بڑی نادر اور منفرد تشبیہیں، استعارات، تراکیب استعمال کی ہیں۔ غالب نے مروجہ اسلوب کی عام پسندیدہ اور پیش پا افتادہ صنعتوں سے کام نہیں لیا۔ ان کے انداز بیان میں جو تازگی اور نیا پن ہے وہ ان کی انفرادیت کا عکاس ہے انہوں نے اظہار مطلب کے لئے نئے پیرائے تلاش کئے ہیں جو ہیئت میں کسی نمایاں تبدیلی کی صورت میں نہیں ہیں بلکہ لفظوں کے اثر انگیز اور معنی خیز معرکوں کی صورت میں ہیں۔

ترکیب سازی سے غالب کو خاص شغف ہے اس کی ایک وجہ اس کے تجربات کی نوعیت بھی ہے وہ یہاں اردو غزل کی روایت سے الگ نظر آتے ہیں اکثر و بیشتر کوئی اچھوتا خیال کوئی باریک فکری نکتہ ان کے اشعار کا موضوع ہوتا ہے۔ تجزیہ اور تحلیل ان کی طبعیت کا خاصہ ہے مگر غالب کے تجربات محض خیال و فکر اور تجزیہ و تحلیل تک محدود نہیں ہوتے ان میں جذبے کا آب و رنگ اور اس کی لرزش ہی سموئی ہوتی ہیں۔ غالب خیال کو جذبے کی سطح پر محسوس کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ایسی پیچیدہ اور مرکب تجرباتی کیفیت جس میں فکر وخیال کی آمیزش، تجزیے کی باریکی، جذبے کی نرمی یہ سب خصوصیات قائم کرنے کے ساتھ ابلاغ کا فریضہ بھی ادا ہو پھر یہ وسیلہ اظہار غزل ہونے والی تشبیہات و استعارات کے ساتھ تراکیب میں کم سے کم الفاظ میں ادا ہوں مرزا غالب ان تمام وسیلوں کو برتتے ہیں ان کا جمال ہزار تفصیل پر بھاری ہوتا ہے۔

؎نالہ جز حسن طلب اے ستم !ایجاد نہیں ہے تقاضائے جفا شکوہء بیداد نہیں
؎رشک ہم طرحی و درد اثر بانگ حزیں نالہ مرغ سحر تیغ دودم ہے ہم کو
؎ہے سنگ پر برآت معاش جنون عشق یعنی ہنوز منت طفلاں اٹھائیے36

اختر اورنیوی لکھتے ہیں:

"غالب کی پیش کش میں ہنر مندی شائستگی علو چابک دستی نازک قلم کاری، شادابی، اور مجموعی دلکشی پائی جاتی ہے۔ انتخاب

الفاظ تراکیب وقماش بندی میں غالب نفیس اور رفیع ذوق کا ثبوت دیتا ہے۔ان میں اس کی قوت اختراع و تخلیق کا اظہار ہوتا ہے۔کامیاب تشبیہات اور پر معنی استعارات حسن انتخاب و تراکیب سے پیدا کئے جاتے ہیں۔اس تخلیق میں غالب کے تخیل کا براد خل ہے۔لب ولہجہ آہنگ و آنچ کی تاثیر سے غالب اچھی طرح واقف ہیں۔"۔37

حسن و عشق ایک ہی ذہنی کیفیت کے دو بظاہر مختلف ظہور ہیں عشق وہیں ہوتا ہے جہاں حسن نظر آئے اور جہاں عشق ہو وہاں حسن ضرور ہوتا ہے۔

؎شوخیء حسن و عشق ہے آئینہ دار ہم مگر خار کو بے نیام جاں ہم کو برہنہ پا سمجھ38

حسن کو عموما ایک بیرونی حقیقت مانا جاتا ہے۔ایک ایسی چیز جو ہمارے ذہن سے علیحدہ مستقل وجود رکھتی ہے۔اور عشق اس بیرونی حقیقت سے ہمارا وہ ذہنی تعلق ہے جو بالعموم خواہش کے رنگ میں پیدا ہوتا ہے۔اس سے ظاہر ہے کہ تصور حسن اور عشق میں ہماری اپنی شخصیت منعکس ہوتی ہے۔غالب کا تصور حسن و عشق اس کی شخصیت کا مسلئہ ہے اس کی بناء پر غالب کے ذہن حدود متعین کرنے میں مدد ملتی ہے۔غالب نے حسن کی تفصیلی تصویر کشی کہیں نہ کہیں اس قسم کا سراپا باندھا ہے جو مثلا میر حسن یا جرآت یا ذوق کے کلام میں مل سکتا ہے۔ان کے دیوان میں ایسے اشعار کی تعداد بہت کم ہے جن میں شاعر نے

؎زلف سیاہ رخ پہ پریشاں کئے ہوئے

کی حد تک صراحت سے کام لیا ہے۔اور یوں بھی بیشتر اشعار حسن کے بجائے عشق کے موضوع پر ہیں۔حسن کی مصوری ان کے یہاں رسمی تشبیہہ کی حد سے آگے نہیں بڑھی۔حسن کا جلوہ صورت مہر نیم روز ہے اور حسن مہ بہ ہنگام کمال سے بڑھ کر ہے۔حوران خلد میں بھی وہ صورت نہیں تھی اس کی جھلک یوں ہے کہ جیسے آنکھوں کے آگے ایک بجلی کوند گئی قدیار کا عالم فتنہ محشر کی یاد دلاتا ہے اس کی کمر موہوم ہے اور ذہن نامعلوم غرض یہ کہ پورا دیوان کے پس پردہ کوئی واضح انسانی صورت سامنے نہیں آتی۔حقیقت یہ ہے کہ اس قسم کی صورت گری غالب کی شاعری کے موضوع ہے ہی نہیں۔روایتی تشبیہ سے شاعر نے جابجا کام ضرور لیا ہے لیکن یہ تشبیہہ اس کے لئے باعث کشش نہیں ہے۔بالعموم اس کا استعمال ضمنی ہے اس کی ہلکی سی بنیاد پر وہ کسی لطیف نکتے کی تعمیر کرتا ہے لیکن پیکر حسن کی وہ مفصل عکاسی جو روایتی سراپے سے مخصوص ہے غالب کے ہاں کہیں نہیں ملتی۔دراصل غالب کو حسن کی تصویر سے نہیں اس کی تاثر سے سروکار ہے جہاں کہیں اسے حسن کی مصوری کرنا مقصود ہے وہاں انہوں نے صرف اشارات سے کام لیا ہے اور بہت کچھ پڑھنے والے کے تخیل پر چھوڑ دیا ہے۔اس طرح پڑھنے والے کا شعور تخلیق کے عمل میں شاعر کے ساتھ شریک رہتا ہے مثلا

؎الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہوں

؎کیا آئینے خانے کا وہ نقشہ تیرے جلوے نے کرے جو پرتو خورشید عالم شبنمستاں کا

؎منہ نہ کھلنے پر وہ عالم ہے کہ دیکھا ہی نہیں زلف سے بڑھ کر نقاب اس شوخ کے منہ پر کھلا۔39

لیکن یہ اشارات کسی پیکر حسن کے قریب پہنچ کر میسر آتے ہیں بعض دفعہ اس پیکر کے صرف بیرونی حاشیے کی جھلک ہم کو دکھادی جاتی ہے۔

ترے جواہر طرف کلہ کو کیا دیکھیں ہم اوج طالع لعل و گہر کو دیکھتے ہیں

ایک منزل اس سے بھی آگے ہے جہاں غالب حسن کی توصیف تو کیا اس کا ذکر تک نہیں کرتے لیکن کسی ایسی لطیف چیز سے اس کی نسبت تلاش کرتا ہے کہ ہمارا تصور خود پیکر حسن کی لطافت تک جا پہنچا ہے۔

ایجاد کرتی ہے اسے ترے لئے بہار میرا رقیب ہے نفس عطر سائے گل۔40

نسائی حسن کے تین عطر ایسے ہیں جنھیں غالب کے تخیل میں نمایاں اور مستقل جگہ ملی ہے ان میں سب سے خاص کیفیت قامت یار کی رعنائی ہے۔

اگر وہ سرو قد گرم خرام ناز آجاوے کف ہر خاک گلشن شکل قمر نالہ فرسا ہو

دوسرے جزائے حسن مثلاً چہرے کی خوبی کا ذکر بھی ہے لیکن خوبی قامت سے شاعر کی دل بستگی کا اظہار بھی شامل ہے۔ حسن قامت کی بجائے خود اس کے تخیل میں ایک مستقل حیثیت حاصل ہے۔ نسوانی پیکر کی شوخیءورعنائی پر غالب کی نظر بار بار اٹھتی ہے۔

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم آنا ہی سمجھ میں مری آتا نہیں گو آتے

نہیں نگار کی الفت نہ ہو نگار تو ہے روانیءروش و مستی ادا کہیے 41

زلف سیاہ اردو اور فارسی شاعری کا خاص سرمایہ ہے لیکن غالب نے اس میں بہت سے اضافے کئے ہیں اور اپنی شخصیت کے پیچ و تاب کو اس خلوص و جوش سے شامل حال کیا ہے کہ اس پامال مضمون میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔

تو اور آرائش خم کاکل میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

زلف خیال نازک و اظہار بے قرار یارب بیان شانہ کش گفتگو نہ ہو

یاد کرو وہ دن کہ اک اک حلقہءترے دام کا انتظار صید میں اک دیدہ بے خواب تھا42

غالب کے تصور حسن کی ایک گہری خصوصیت نگہء چشم سرمہ سا ہے۔ غالب کے نزدیک محبوب کی چشم و نگاہ کی لذتیں حسن کے سب سے قیمتی انعامات ہیں۔ حمید احمد خان لکھتے ہیں:

"حسن و عشق کے شعراء میں سے شاید ہی کسی نے چشم و نگاہ کی ان تمام کیفیتوں کا جو شرمگی سے بے باکی تک پہنچتی ہیں اس ذوق و شوق سے منزل بہ منزل ساتھ دیا ہو جس سے غالب ان کی تعریف کرتے جائیں۔"43

چشم خوباں خامشی میں بھی نوا پرداز ہے سرمہ تو کہوے کہ دو شعلہء آواز ہے

خموشیوں میں تماشا ادا نکلتی ہے نگاہ دل سے ترے سرمہ سا نکلتی ہے

کرے ہے قتل لگاوٹ میں ترا رو دینا تری طرح کوئی تیغ نگہ کو آب تو دے44

غالب نے چشم و نظر کے موضوع پر رنگ برنگ مضمون پیدا کئے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ غالب کو اس کے علاوہ حسن کے کسی پہلو سے شگفتگی ہی نہیں۔

تو اور سوئے غیر نظر ہائے تیز تیز میں اور دکھ تری مژہ ہائے دراز کا

؎وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار جو میری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہو گئیں
؎بہت دنوں میں تغافل نے ترے پیدا کی وہ اک نگاہ جو بظاہر نگاہ سے کم ہے۔45

یہ غالب کے تصور حسن کے نمایاں اجزاء ہیں اب اگر اس حسن کو بطور ایک کل کے دیکھیے تو دو نکتے بالکل واضح ہو جاتے ہیں۔ اول یہ کہ غالب کا محبوب ایک جاندار انسانی شخصیت ہے۔ محض ایک حسین نقش ہی نہیں غالب اس کے حسن کی توصیف میں کوئی رسمی تشبیہہ استعمال کرتا ہے تو فوراً اس تشبیہہ پر کسی انسانی خاصے کا اضافہ کر کے اس نقش کی زندہ کر دیتا ہے۔ وہ اپنے محبوب کی آب وگل میں فتنہ شور قیامت دیکھنا چاہتا ہے کیونکہ نہ شعلے میں یہ کرشمہ نہ برق میں یہ ادا۔ وہ شوخ وشنگ بے باک تنک مزاج، بیوفا غیر منطقی بھی جو کچھ ہے مگر خون آشام درندگی کے ان خصائص سے مبری ہے جو شعراء کے روایتی معشوق میں خواہی نخواہی موجود ہوتے ہیں اس کی انسانی صورت ہمیشہ قائم رہتی ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ غالب حسن کا تصور کرتا ہے بارھا اسے سکون کے بجائے حرکت میں دیکھتے ہیں موج خرام یار بھی کیا گل کترگئی لرزے ہے موج مے تیری رفتار دیکھ کر لطف خرام ساقی ذوق صدائے چنگ میں شاعر کی ذہنی کیفیت بالکل واضح ہے لیکن اس سے قطع نظر مختلف اشعار میں یہ کیفیت بھی موجود ہے کہ حسن کے گرد وپیش کی جو چیزیں طبعاً ساکن ہیں وہ بھی شاعر کی عالم ذوق میں متحرک ہوتی نظر آتی ہیں چنانچہ یہ متحرک حسن جب باغ کی روشوں پر خراماں خراماں نکلتا ہے۔ اور سبز پوش درختوں کے درمیان اس کا پیکر کبھی نظروں سے اوجھل ہوتا کبھی اپنی جھلک دکھاتا ہوا گذرتا ہے تو یہ خاموش درخت بھی عالم سرخوشی میں اٹھ کر اس کے ساتھ ہو جاتے ہیں۔

؎سائے کی طرح ساتھ پھریں سرو وصنوبر تو اس قد دلکش سے جو گلزار میں آوے
؎جس بزم میں تو ناز سے گفتار میں آوے جاں کالبد صورت دیوار میں آوے
؎اس چشم فسوں گر کا اگر پائے اشارہ طوطی کی طرح آئینہ گفتار میں آوے

غالب کو اپنے ترجمان عشق ہونے پر ناز ہے۔

؎بلبل گلشن آمدہ غالب نازل حیف گر زمزمہ مدح وثناخیز دازو۔46

غالب کے عشق کی اہم خصوصیت تمکین وضبط ہے۔ ان کے ہاں بدنی لذت وطلب بہت غالب نہیں۔ اگرچہ ابتداء میں والہانہ رندی کے مضامین بار بار ملتے ہیں مگر تامل واحتیاط کا دامن کہیں ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ آگے چل کر ان کا عشق لمس ظاہر سے بے نیاز ہو جاتا ہے اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ مژدہ بوس وکنار اور جور وجفا دونوں نتیجے کے لحاظ سے ایک ہو جاتے ہیں۔ اور شاعر کا احساس کچھ نئی کیفیتوں سے لذت اندوز ہوتا ہے۔

؎تھی وہ اک شخص کے تصور سے اب وہ رعنائی خیال کہاں
؎پھر چاہتا ہوں نامہ دل دار کھولنا جاں نذر دلفریبی عنواں کئے ہوئے
؎دیکھو تو دل فریبی انداز نقش پا موج خرام یار بھی کیا گل کرگنجاء
؎نیند اسکی ہے دماغ اس کا ہے راتیں اس کی ہیں تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہوئیں
؎گر ترے دل میں خیال وصل میں شوق کا زوال موج محیط آب میں مارے ہے دست وپا کہ یوں47

اگر چہ مرزا غالب جسمانی حسن کو دعوت نظر کا سامان سمجھتے اور اس کے نظارے سے پوری طرح نہ لطف اندوز ہوتے ہیں لیکن اس کا ذوق نظارہ بحیثیت مجموعی خالص ذوق جمال ہے ہوس بدن نہیں ہے وہ ہوس اور عشق میں فرق کرتے ہیں۔

؎ ہر بوالہوس نے حسن پرستی شعار کی اب آبروئے شیوہ اہل نظر گئی

غالب کے ذوق نظر کی کیفیت صرف یہی نہیں ہے کہ وہ نمایاں طور پر جمالیات کے قریب اور جنیت سے دور ہے۔ ان کا ایک امتیاز ان کی فلسفیانہ شدت ہے اس کی محض ایک تماشائی کا انداز نگاہ پند نہیں ہے وہ یوں سراپا انتظار بن جاتے ہیں۔ کہ اس کے روح اور جسم کی تمام قوتیں ان کی آنکھوں میں سمٹ آتی ہیں۔ وہ حسن کی طرف دیکھتے ہی نہیں اس کے نظارے میں کھو جانا چاہتے ہیں اسے محسوس کرنا چاہتے ہیں۔

؎ ہنوز محرمئ حسن کو ترستا ہوں کرے ہے ہر بن مو کام چشم بینا کا48

یہ جذبہ محسوسات کی لذتوں سے شروع ہو کر لطیف سے لطیف تر شکلیں اختیار کرتا ہو بالا خر روح کی بلندیوں تک پہنچتا ہے اور وہاں ایک اخلاقی جوہر عجیب و غریب معلوم ہوتا ہے۔ اس شاعری میں عشق رات دن کی بے کاری اور لا ابالی پن کا دوسرا نام ہے عاشق ہوش و خرد سے بے نیاز اور معشوق بے وفا و ستم پیشگی انسانی فطرت اور اس کے ممکنات کو ظاہر ہونے کے لیے للکارتی ہیں اور جیسا شاعر کا ظرف ہوتا ہے ویسا ہی اخلاقی کمال اس کے تصور عشق میں نمودار ہوتا ہے۔ غالب کے ہاں عشق کی شدت اور خلوص زندگی کو ایک نیا مفہوم دیتا ہے۔

؎ عشق سے طبعیت نے زیست کا مزہ پایا درد کی دوا پائی درد لا دوا پایا

؎ رونق ہستی سے عشق خانہ ویراں ساز سے انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں 49

؎ غالب کو عشق کے خانہ ویراں ساز ہونے کا یقین ہے وہ ارزاں عشق کے قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ جس میں جفا طلبی اور آزاد پسندی نہ پائی جائے۔ غالب کے عشقیہ کلام میں والہانہ جوش و خروش تو پایا جاتا ہے مگر اس میں نہ حافظ کی شیرینی اور سادگی و برجستگی ہے نہ میر کا سوز اور عجز و نیاز اس کی ایک وجہ غالب کی فطری عقلیت اور تحلیلی انداز فکر ہے اور دوسری وجہ غالب کی انتہائی خود داری اور خود نگری ہے جس کے ہوتے ہوئے افتادگی اور سوز کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ غالب نے حافظ کے برعکس احساس سے زیادہ عقل پر انحصار کیا ہے۔ ان کے ہاں عقل کا کڑا حصار اور ارادے کا تناؤ صاف جھلکتا ہے۔

؎ ملا سے گر مژہء یار تشنہ خوں ہے رکھوں کچھ اپنی بھی مژگاں خوں فشاں کے لئے

؎ ایک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب خون جگر ودیعت مژگاں یار تھا

؎ رونے سے اے ندیم! ملامت نہ کر مجھے آخر کبھی تو عقدہء دل وا کرے کوئی 50

غالب جہاں عجز پر بھی آمادہ ہوں وہاں بسا اوقات لہجے کی سختی سے یہ گماں ہوتا ہے کہ فریق ثانی کو دعوت مکالمہ دے رہا ہے۔ ذوق و سرور کے عالم میں بھی غالب کی یہ خود مرکزیت بار بار ابھر آتی ہے۔

؎ ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے بے نیازی تری عادت ہی سہی

؎ سچ کہتے ہو خود بیں و خود آرا ہوں نہ کیوں ہوں بیٹھا ہے بت آئینہ سیما میرے آگے 51

اسی خود داری اور خود نگری کا دوسرا پہلو وضعداری ہے جس کا غالب کو اتنا خیال ہے کہ ملاقات کی مسرت کو اس پر بے تکلف قربان

کر دیتے ہیں

؎واں وہ غرور عز و ناز یاں یہ حجاب پاس وضع راہ میں ہم ملیں کہاں بزم میں وہ بلائے کیوں

غالب کی عقلیت بار ہا مضامین عشق میں بھی دلیل آرائی کے مواقع ڈھونڈتی ہے کسی ایسے شخص سے عجز و نیاز کی زیادہ امید رکھنا لا حاصل ہے جو عشق کے معاملات میں بھی بحث و استدلال کا دروازہ کھول دینے کا عادی ہو۔

؎غلط ہے جذبِ دل کا شکوہ دیکھو خرام کس کا ہے نہ کھینچو گر تم اپنے کو کشاکش درمیاں کیوں ہو52

یہی عقلیت جنون عشق میں بھی غالب کے ہاتھ سے ہوش کا دامن چھٹنے نہیں دیتی وہ اس دیوانگی کے عالم میں بھی صحرا کی خاک چھانتے پھرتے ہیں۔ کبھی ناگہاں منزل محبوب کے پاس جانکلتے ہیں لیکن اپنی مجنونانہ حرکات کو اسی سکون کی خاطر اور سلامت طبع سے دیکھتے ہیں جیسے عشق میں کوئی شخص مبتلا ہے اور وہ خود تماشائی ہے

؎گوشہء ویرانہ را آفت ہر روزہ ام منزل جانانہ را فتنہء ناگاہیم

ہوں میں بھی تماشائی نیرنگ تمنا مطلب نہیں کچھ اس میں کہ مطلب ہی بر آوے53

حمید احمد خان لکھتے ہیں:

"وارداتِ قلبی کی یہ آزمائش یہ تماشای یہ یاد علم النفس کے طریق کار سے ملتی جلتی ہے ایسے بیسوں شعر نظر آتے ہیں جن میں غالب کا عشق عاشقانہ نہیں طالب علمانہ ہے۔ اسے عشق کی نفسیاتی کیفیتوں سے عشق ہے چنانچہ اس کے عشقیہء کلام کا ایک قابل ذکر حصہ انہی کیفیتوں کے مشاہدے پر مبنی ہے اس مشاہدے کی وسعت ہمہ گیری لطافت اور گہرائی غزل کی دنیا میں اپنی مثال آپ ہیں۔"54

معاملہ بندی میں دوسرے غزل گو شعراء نے بھی کمال دکھایا ہے مگر غالب کا امتیاز یہ ہے کہ وہ نہ صرف حسن و عشق کے باہمی معاملات کی تصویر کھینچتا ہے بلکہ بے انتہا صفائی اور خوبی سے ان محرکات کی تشریح بھی کر دیتا ہے۔ جو ان معاملات کے پیچھے ہیں حسن و عشق کے موضوع پر غالب کے کلام کا بڑا حصہ شفاف ہے کثیف نہیں۔ مثلاً یہی ایک کیفیت کہ حسن اپنے آپ کو عشق کی خاطر آراستہ کرتا ہے۔ طرح طرح کے واقعات واردات اور معاملات میں ظاہر ہوتی ہے۔

؎حسن بے پرواہ خریدار متاع جلوہ ہے آئینہ زانوئے فکر اختراع جلوہ ہے

؎حسن غمزے کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

؎جب کرم رخصت بے باکی و گستاخی دے کوئی تقصیر بجز خجلت تقصیر نہیں

؎غیر کو یارب وہ کیونکر منع گستاخی کرے حیا بھی اس کو آتی ہے تو شرما جائے ہے55

غالب کے یہاں تین مختلف قسم کے محبوب کا کردار تین مختلف سطحوں پر پایا جاتا ہے۔ یا یوں کہہ لیا جائے کہ ان کی شاعری میں محبوب کے جو خدوخال ابھرتے ہیں وہ ایک شخصیت نہیں بلکہ تین مختلف شخصیات ہیں۔ ان کے یہاں ایک محبوب تو وہ ہے جو ادبی روایتی یعنی اس میں ساری خصوصیات پائی جاتی ہیں اور کسی حد تک اس میں وہ تمام خصوصیات تصور کی جاسکتی ہیں جو ہندوستانی و ایرانی غزل گو شعراء کے کم و بیش منفرد محبوبوں میں مشترک ہیں لیکن وہ کسی ایسی صفت سے یکسر محروم ہے جو ان خصوصیات کو کسی نئی سطح اور ترتیب دے کر اسے ایک کل میں منتقل

کر دے مثال کے طور پر یہ اشعار دیکھے جاسکتے ہیں۔

؎ رخسار یار کی جو ہوئی جلوہ گری زلف سیاہ بھی شب مہتاب گل ہو گئی

؎ وہ شوخ اپنے حسن پر مغرور ہے اسد دکھلا کے اس کو آئینہ توڑا کرے کوئی 56

دوسرا محبوب بھی اگرچہ زمینی و روایتی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ روایتی محبوبوں کا ایسا واسطہ ہے جس میں انفرادیت پائی جاتی ہے۔ مگر اس کی انفرادیت کا سبب نہ تو اس کے انسانی اوصاف ہیں اور نہ ان میں سے کوئی ایک وصف ایک قوت ہے کہ وہ باقی اوصاف کو ایک مخصوص سانچے میں ڈھال دے پر انفرادیت کسی ایسے وصف سے ابھرتی ہے جو عاشق اپنے سستے احساسات اور مصنوعی میلانات کے وسیلے سے محبوب میں دریافت کرتا ہے۔

؎ ہے سوا نیزے پہ اس کے قامت نوخیز سے آفتاب صبح محشر سے گل و دستار دوست

؎ شمع سے ہے بزم انگشت تحریر درد تہیں مشعلہء آواز خوباں پہ بہ ہنگام سماع

؎ ہوا آئینہ جام بادہ عکس روئے گلگوں سے نشان خال رخ داغ شراب پر تگالی ہے

؎ دیکھ تری خوئے گرم دل بہ تیش رام ہے طائر سیماب کو شعلہء رگ دام ہے 57

غالب کی شاعری میں اپنے محبوب کی شخصیت کے نقوش ابھرتے ہیں وہ رسمی نہیں ہے انکے منفرد ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ یہ انفرادیت انسانی خوبیوں میں سے کسی ایک کے اعلان سے ابھرتی ہے وہ ایک ہمہ گیر شخصیت کا مالک ہے۔ وہ عاشق کے سارے حواس بیدار کرنے اور اس کے دل میں نئے نئے احساسات جگانے پر قادر ہے۔ ان کی عقل دراک ہے یعنی وہ معاملہ فہم بھی ہے۔ اور مردم شناس بھی۔ موقع محل کے مطابق عمل کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ وہ خود پرست بھی ہے۔ اس کا سب سے ممتاز وصف یہ ہے کہ اس کو فتح کرنا بہت دشوار ہے۔ سادہ پرکار ہے تغافل آشنا ہے۔ حوصلہ مند ہے سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی موجودگی میں اور اس کی توجہ سے عاشق کو نہ صرف اپنی روح میں بلکہ دنیا میں ہر کہیں بالیدگی و نمو کا احساس ہوتا ہے۔ اس خصوصیات کا کوئی نام نہ ہو لیکن یہ ایک ایسا روحانی تصرف ہے جو اپنی قوت اور تاثیر سے خود کو منوالیتا ہے۔

؎ وہ بھی دن ہو کہ اس ستم گر سے ناز کھینچوں بجائے حسرت ناز

؎ سادہ پرکار ہیں خوباں غالب ہم سے پیمان وفا باندھتے ہیں

؎ جہاں تیرا نقش قدم دیکھتے ہیں خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں 58

انفرادی اور ذاتی غم دونوں غالب کی شاعری کا موضوع رہا ہے ان کے ہاں محرومی اور غم کا احساس نمایاں ہے مگر غم میر کی طرح ان کے رگ وپے میں نہیں اترا تھا۔ ان کی رگوں میں گرم خون دوڑتا تھا ان کی طبعیت میں فطری طور پر زیادہ تب و تاب اور حرکت تھی۔ غالب باب غم تھے جو ترک کرنا نہیں جانتے تھے۔ اسی لئے ان کے ہاں غم میں پر تمکنت اور پر شکوہ انداز پایا جاتا ہے۔

؎ رگ وپے میں اترے زہر غم تب دیکھیے کیا ہوتا ہے ابھی تو قلعی ءکام و دہن کی آزمائش ہے

زندگی کی بے پایاں طلب کے باوجود ایک مستقل اور جاں گداز احساس محرومی غالب کی داخلی کشمکش کی بنیاد ہے۔ غالب نے اسی شدت

طلب کے زیر اثر زندگی سے بے اندازہ خواہشیں وابستہ کر رکھیں ہیں چنانچہ یہ کہنا درست ہے کہ غالب اپنی افتاد طبع کی بدولت شروع ہی سے اس راستے پر ہوئے جہاں محرومیاں اور ناکامیاں سامنے آتی ہیں۔ چنانچہ ایک مسلسل اضطراب اور نا آسودگی برقرار رکھتے ہیں۔

؎جاتا ہوں داغ حسرت ہستی لیے ہوئے ہوں شمع کشتہ در خور محفل نہیں رہا59

غالب غموں سے شکست قبول کرنا نہیں جانتے، وہ غم کو منانا جانتے ہیں۔ البتہ ان کا المیہ یہ ہے کہ وہ غم کو جس طور برتنا چاہتے ہیں برت نہیں سکے۔ اس احساس سے خود ترحمی پیدا ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ وہ غموں سے لذت کشید کرنا بھی جانتے ہیں اس طرح اپنے رنج والم کو اپنے لئے گوارا بنا لیتے ہیں۔ چنانچہ غم کے سلسلے میں ان کا سب سے بڑا رویہ تحسین و تعریف کا بھی ہے۔ ان کا رجحان ہے کہ غم کے نتیجے میں سوچ اور فکر کی قوتیں جاگتی ہیں اور شکر کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ یہ غم ہی ہے جو شخصیت کی تعمیر و تخریب میں حصہ لیتا ہے اور اس پر دیرپا اثرات چھوڑتا ہے۔

غالب کے تمام ناقدان کے بارے میں متفق الرائے نظر آتے ہیں کہ حکیمانہ نظر اور شاعرانہ بصیرت کا مکمل امتزاج ان کی شاعری کی امتیازی خصوصیت ہے۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے لیکن اس کے ساتھ یہ توضیح بھی ضروری ہے کہ جس چیز نے اس امتزاج کو ممکن بنایا وہ ان کی تخیل کی خلاقی اور تازہ کاری ہے اس کا زندہ ثبوت اور وسیلہء اظہار وہ زندہ و تابندہ اور متحرک تماثیل شعری ہیں جو اظہار کے لئے الفاظ معنی کے رسمی روابط کی بجائے معنی و صورت کے بنیادی تعلق کی مرہون منت ہوتی ہیں۔ ان کی امتیازی خصوصیات وسعت و فراوانی نے ہمہ گیری تازگی و ندرت و قیامت اور تابندگی حرکت و توانائی پہلوداری رنگارنگی اور گہرائی ہیں انہی کی بدولت غالب کی تماثیل شعری میں گہری معنویت اور دوررس دلالت پیدا ہوئی ہے۔ ان کی اس خصوصیت سے ان کی ژرف نگاہی اور باریک بینی کا بھی پتہ چلتا ہے جو چھوٹی سے چھوٹی بات عام یا پیش پا افتادہ بات میں گہرے اور دوررس معانی ڈھونڈتی ہے اور اسے عام مشاہدات زندگی کے کسی بڑے معنی خیز تجربے سے مربوط کر دیتی ہے۔

؎قطرے میں دجلہ دکھائی دے اور جز میں کل کھیل لڑکوں کا ہوا دیدہ بینا نہ ہوا
؎بخشے ہے جلوہ گل ذوق تماشا غالب چشم کو چاہیے ہر رنگ میں وا ہو جانا
؎لطافت بے کثافت جلوہ پیدا کر نہیں سکتی چمن زنگار ہے آئینہ باد بہاری کا
؎میری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی صیونی برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا
؎نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا مستی سے ہر نگاہ تیرے رخ پر بکھر گئی
؎آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں60

غالب کی تماثیل سازی کی ایک اور جاذب نظر خصوصیت شدت تاثر اور ذکاوت جس کی وہ کیفیت ہے جس کی بدولت عام اور پیش پا افتادہ تمثال شدید جذباتی یا حسی تجربے کے اظہار کا وسیلہ بن جاتی ہے۔ جذبے یا خیال کی سطح کتنی ہی بلند کیوں نہ ہو ان کی تمثال شعری حسی تجربات میں اولیت بصری تاثرات کی حامل ہے۔ صوتی تمثال کی مثالیں بھی ملتی ہیں ان کے ساتھ دوسرے حواس سے ماخوذ تمثال شعری بھی ملتی ہیں لیکن ان میں وہ وضاحت تابناکی اور رنگینی نہیں ہے جو بصری تمثالوں کی امتیازی خصوصیت ہے۔

؎ڈھونڈے ہے اس مغنی آتش نفس کو جی جس کی صدا ہو جلوہء برق فنا مجھے
؎ہر قدم دوری منزل ہے نمایاں مجھ سے میری رفتار سے بھاگے ہے بیاباں مجھ سے

؎رو میں ہے رخش عمر کہاں دیکھیے تھمے نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں 61

مرزا غالب کے اسلوب شاعرانہ میں جو چیز بہت نمایاں ہے وہ ان کا سوالیہ یا استفہام یہ لب و لہجہ ہے اس لب و لہجے سے ان کی جدت طرازی اور مشکل پسندی اور فلسفیانہ طرز فکر تینوں کا سراغ ملتا ہے بقول ڈاکٹر فرمان فتحپوری:

"غالب اردو کے ایسے شاعر ہیں جنہوں نے کلمات استفہام کی گہرائیوں اور لطافتوں کو شدت سے محسوس کیا اور استفساریہ انداز بیان میں پورا زور صرف کیا۔ چنانچہ مرزا کے اسلوب بیان کی جدت کا راز بڑی حد تک اسی انداز میں پوشیدہ ہے۔"62

غالب کا یہ استفہام کہیں برائے استفہام ہے اور کہیں برائے استعجاب کہیں صنعت سوال و جواب پیدا کی گئی ہے اور کہیں کلمات استفہام کی مدد سے یہ رنگ چڑھایا گیا ہے اور کہیں صرف لب و لہجے سے انفرادیت قائم کی گئی ہے۔

؎نقش فریادی ہے کس کی شوخیء تحریر کا کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

؎کہتے ہو نہ دیں گے ہم دل اگر پڑا پایا دل کہاں کہ گم کیجیے ہم نے مدعا پایا

؎کوئی میرے دل سے پوچھے تیرے تیر نیم کش کو یہ خلش کہاں سے اٹھتی جو جگر کے پار ہوتا63

کلام غالب کا احاطہ ہر دور میں آنے والے ناقدین کے لئے نئی معنویت کا در کھولتا ہے اور جہان معنی کی عصری پیروی واشگاف ہوتی ہے جس بناء پر مرزا غالب کی شاعرانہ قد و قامت آفاقیت کے مقام کو چھو لیتی ہے۔

حوالہ جات:

1۔رام بابو سکسینہ، ہسٹری آف اردو لٹریچر، ترجمہ مرزا محمد عسکری، لکھنؤ منشی نولکشور ص382)،1929

2۔ایس۔ایم۔اکرام، غالب کی عشقیہ شاعری، احوال نقد غالب، محمد حیات خاں سیال لاہور نذر سنز ص392،1967

3۔الطاف حسین حالی، مقدمہ شعر و شاعری پبلیشر ص13

4۔یوسف حسین خان، غالب کی فارسی غزلیں، نئی دلی غالب انسٹیوٹ، ص89،1980

5۔سید رفیع الدین بلخی، تجزیہ کلام غالب، اکیڈمی آف ایجوکیشنل ریسرچ ص14،66،1965

6۔ایضاص16

7۔اسلوب احمد انصاری، غالب کا فن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ص1970160

8۔مرزا غالب، دیوان غالب، نسخہء حمیدیہ (حمید احمد خاں) مجلس ترقی ادب لاہور 2 ایڈیشن 1969

9۔ایضا

10۔ال احمد سرور، عکس غالب، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ص145،1973

11۔اسلوب احمد انصاری، غالب کا فن، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ س245۔1970

12۔مرزا غالب، دیوان غالب، نسخہء حمیدیہ (حمید احمد خاں) مجلس ترقی ادب لاہور 2 ایڈیشن 1969

13۔ایضا

14۔ایضا

15۔ایضا

16۔احتشام حسین، شرح دیوان غالب، کتاب نگر دین دیال روڈ لکھنؤ، ص52، 1957

17۔مرزا غالب، دیوان غالب، نسخہ ءحمیدیہ (حمید احمد خاں) مجلس ترقی ادب لاہور 2 ایڈیشن 1969

18۔ایضا

19۔اسلوب احمد انصاری، غالب کا فن، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ص267۔1970

20۔مرزا غالب، دیوان غالب، نسخہ ءحمیدیہ (حمید احمد خاں) مجلس ترقی ادب لاہور 2 ایڈیشن 1969

21۔ایضا

22۔ایضا

23۔ایضا

24۔ایضا

25۔ایضا

26۔ایضا

27۔الطاف حسین حالی، یادگار غالب، نامی پریس کانپور، ص78، 1897

28۔مرزا غالب، دیوان غالب، نسخہ ءحمیدیہ (حمید احمد خاں) مجلس ترقی ادب لاہور 2 ایڈیشن 1969

29۔فرمان فتح پوری، غالب اور غالبیات، بیکن بکس ملتان۔2005، ص201

30۔مرزا غالب، دیوان غالب، نسخہ ءحمیدیہ (حمید احمد خاں) مجلس ترقی ادب لاہور 2 ایڈیشن 1969

31۔ایضا

32۔ایضا

33۔اے۔زیڈ حسن، مرزا غالب اور جان کیٹس کا فکر و فن کا تقابلی مطالعہ، ایجوکیشنل پبلیشنگ ہاؤس دہلی انڈیا، 2021

34۔مرزا غالب، دیوان غالب، نسخہ ءحمیدیہ (حمید احمد خاں) مجلس ترقی ادب لاہور 2 ایڈیشن 1969

35۔ایضا

36۔ایضا

37۔اختر اورینوی، اختر اورینوی نمبر ص65، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ 1965

38۔مرزا غالب، دیوان غالب، نسخہ ءحمیدیہ (حمید احمد خاں) مجلس ترقی ادب لاہور 2 ایڈیشن 1969

39۔ایضا

40۔ ایضا

41۔ ایضا

42۔ ایضا

43۔ حمید احمد خاں، شرح دیوان غالب، انجمن ترقی ادب لاہور، ص25، 1975

44۔ مرزا غالب، دیوان غالب، نسخہ ءحمیدیہ (حمید احمد خاں) مجلس ترقی ادب لاہور 2 ایڈیشن 1969

45۔ ایضا

46۔ ایضا

47۔ ایضا

48۔ ایضا

49۔ ایضا

50۔ ایضا

51۔ ایضا

52۔ ایضا

53۔ ایضا

54۔ حمید احمد خان،، شرح دیوان غالب، انجمن ترقی ادب لاہور، 78ص، 1975

55۔ مرزا غالب، دیوان غالب، نسخہ ءحمیدیہ (حمید احمد خاں) مجلس ترقی ادب لاہور 2 ایڈیشن 1969

56۔ ایضا

57۔ ایضا

58۔ ایضا

59۔ ایضا

60۔ ایضا

61۔ ایضا

62۔ فرمان فتح پوری، غالب اور غالبیات، بیکن بکس ملتان۔ 2005، ص 201

63۔ مرزا غالب، دیوان غالب، نسخہ ءحمیدیہ (حمید احمد خاں) مجلس ترقی ادب لاہور 2 ایڈیشن 1969